فقہاے تابعین کی اہل الحدیث اور اہل الرائے میں تقسیم: ایک تنقیدی جائزہ

سمیع اللہ سعدی ۞

فقہ اسلامی کے مختلف مناہج تاریخ فقہ کا ایک اہم باب ہے۔ تدوین فقہ کے دور میں اسلامی ممالک کے مختلف شہروں سے قابل قدر مجتہدین اٹھے، ہر مجتہد نے اپنے گرد و پیش کے حالات، اپنے ذوق اور اساتذہ کے اسلوب کے مطابق اپنے اصول استنباط و استخراج وضع کیے، ان میں خاص طور پر اہل عراق اور اہل حجاز کے مکاتب فقہیہ میں استنباط واستخراج کے اصولوں میں واضح اور نمایاں فرق تھا۔ اس فرق کی بہت سی وجوہ ہیں، لیکن بعض تاریخی اسباب کی بنا پر یہ مشہور ہو گیا کہ مکتب عراق وحجاز میں جوہری فرق راے اور روایت کا تھا۔ اول الذکر مکتب میں راے کو بنیادی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے اہل الرائے اور ثانی الذکر مکتب میں آثار کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے اہل حدیث کہا جاتا ہے۔ اس مقالے میں درجہ ذیل پہلوؤں سے اس تاریخی مغالطے پر بحث کی گئی ہے:

- اس تقسیم کے اولین قائلین کی تعیین
- معاصرین میں سے اس تقسیم کے قائلین
- اس تقسیم کے سلسلے میں بیان کیے جانے والے بنیادی اسباب کا ناقدانہ جائزہ
- عراق میں احادیث کے ذخیرے کا ایک جائزہ
- حجازی و عراقی مکاتب حدیث کا ایک دوسرے سے اخذ واستفادہ
- حجاز میں راے وقیاس کی کثرت اور اس کے استعمال کے شواہد
- حجازی و عراقی مکاتیب کی اولین کتب فقہیہ کا راے واجتہاد کے حوالے سے موازنہ
- اہل حدیث اور اہل راے کی اصطلاحات کے مختلف مفاہیم اور ان کا ارتقائی جائزہ

۞ محقق، ندوہ لائبریری، چھترپارک، اسلام آباد، (sadyjan100@gmail.com)

تعارف

عصر حاضر میں فقہ اسلامی کی مرحلہ وار، مربوط اور مرتب تاریخ پر قابل قدر علمی کام ہوا ہے اور خاص طور پر عالم عرب سے فقہ اسلامی اور مذاہبِ فقہیہ کے تعارف و تاریخ پر مشتمل انتہائی اہم کتب سامنے آئی ہیں۔ فقہ اسلامی کی تجدید، احیاء اور نت نئے مسائل میں مختلف مکاتب فکر سے اخذ و استفادے کو آسان بنانے میں ان کتب کا بڑا اہم اور بنیادی کردار ہے۔ ان کتب کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ، لیکن ان میں تاریخی حوالے سے مختلف عوامل کی بنیاد پر بعض تسامحات بھی سامنے آئے ہیں اور بلا تحقیق نقل در نقل کی وجہ سے وہ تسامحات کافی مشہور ہوئے۔ زیر نظر مقالے میں ان تسامحات میں ایک اہم تاریخی فروگزاشت پر کچھ معروضات پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سابقہ علمی کام

اس موضوع سے متعلق مختلف پہلوؤں کے جائزے پر مندرجہ ذیل علمی کام کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مدرسة الحديث في الكوفة، شرف محمود

۲۔ عصر التابعين، عبد المنعم الهاشمی

۳۔ الاتجاهات الفقهية عند أصحاب الحديث في القرن الثالث الهجري، عبد المجيد محمود

۴۔ مجلہ جامعۃ الملک سعود میں حمیدان بن عبد اللہ بن محمد الحمیدان کے بعض مقالات

۵۔ الرأي و أثره في الفقه الإسلامي، ادریس جمعہ

۶۔ مشہور فقیہ خلیفہ بابکر الحسن کی گراں قدر کتاب الاجتهاد بالرأي في مدرسة الحجاز الفقهية.

۷۔ ابو بکر اسماعیل محمد میقا کی کتاب الرأي و أثره في مدرسة المدينة.

فقہ اسلامی کی تاریخ پر مشتمل اکثر کتب میں دور تابعین میں اہل حدیث اور اہل رائے کے نام سے فقہا کے دو بڑے گروہ بنائے گئے ہیں، اہل عراق کو اہل رائے کا سرخیل قرار دیا گیا ہے، جب کہ اہل حدیث کی جائے نشو و نما خطہ حجاز کو ٹھہرایا گیا ہے۔ ان دونوں مناہج اور مکاتب فکر میں اساسی و بنیادی فرق اس بات کو قرار دیا گیا ہے کہ اہل رائے نصوص میں تعلیل اور غیر منصوص مسائل میں قیاس و اجتہاد پر زور دیتے تھے، جب کہ اہل حدیث کا

بنیادی وصف نصوص کی بغیر علت تلاش کیے پیروی کرنا اور غیر منصوص مسائل میں حتی الامکان اجتہاد اور قیاس سے اپنے آپ کو دور رکھنا تھا۔ منہج کے اس اختلاف کے اسباب اور عوامل پر بھی معاصر کتب میں گفتگو کی گئی ہے۔

چناں چہ فقہ اسلامی کی تاریخ کی جدید اسلوب میں داغ بیل ڈالنے والے معروف مورخ شیخ خضری بک اپنی مایہ ناز کتاب **تاریخ التشریع الإسلامی** میں لکھتے ہیں:

وجد بذلک أهل حديث و أهل رأي، الأولون يقفون عند ظواهر النصوص بدون بحث في عللها و قلما يفتون برأي، و الأخرون يبحثون عن علل الأحكام و ربط المسائل بعضها ببعض و لا يحجمون عن الرأي، إذا لم يكن عندهم أثر ، وكان أكثر اهل الحجاز أهل حديث و أكثر أهل العراق أهل الرأي.[۱]

ان اسباب کی بنا پر اہل حدیث اور اہل رائے وجود میں آئے ، اہل حدیث نصوص میں علتیں نکالے بغیر ان نصوص کے ظاہری مفہوم پر ٹھہرتے اور (نص نہ ہونے کی صورت میں) قیاس سے بہت کم فتوی دیتے۔ جب کہ اہل رائے احکام کی علتوں کو تلاش کرتے تھے اور غیر منصوص مسائل کو ان معلول بالعلت مسائل کے ساتھ (قیاس کے ذریعے) جوڑتے تھے، نص نہ ہونے کی صورت میں قیاس واجتہاد سے کسی قسم کی کنارہ کشی اختیار نہ کرتے تھے۔ اہل حجاز کے اکثر فقہا اہل حدیث منہج اور عراقی فقہا اہل رائے کے منہج پر تھے۔

شیخ خضری بک کی طرح مذکورہ نظریہ علامہ حجوی نے **الفكر السامي في تاريخ الفقه الإسلامي**[۲] میں، شیخ مناع القطان نے **تاريخ التشريع الإسلامي** میں[۳] صالح الفرفور نے **تاريخ الفقه الإسلامي**[۴] میں، عبد الوہاب الخلاف نے **خلاصة تاريخ التشريع الإسلامي**[۵] میں، عبد الکریم زیدان نے **المدخل إلى دراسة الشريعة الإسلامية**[۶] میں ، شیخ ابو زہرہ مرحوم نے **محاضرات في تاريخ المذاهب**

۱- محمد الخضری بک، **تاريخ التشريع الإسلامي** (بیروت: دارالفکر، ۱۳۸۷ھ)، ۱۲۰۔

۲- محمد بن الحسن الحجوی الثعالبی، **الفكر السامي في تاريخ الفقة الإسلامي** (رباط: إدارة المعارف، ۱۳۴۵ء)،۲: ۸۸۔

۳- مناع القطان، **تاريخ التشريع الإسلامي** (ریاض: مكتبة المعارف للنشر و التوزيع)، ۲۸۹۔

۴- صالح عبد اللطیف الفرفور، **تاريخ الفقه الإسلامي** (بیروت: دار ابن کثیر ۱۴۱۶ھ)، ۳۳۔

۵- عبد الوہاب خلاف، **خلاصة التشريع الإسلامي** (بیروت: دارلقلم)، ۷۵۔

۶- عبد الکریم زیدان، **المدخل إلى دراسة الشريعة الإسلامية** (مصر: دارعمر بن خطاب، ۱۳۸۸ء)، ۱۳۶۔

الفقهية[۷] میں اور ہندوستان کے مشہور عالم مولانا ارسلان رحمانی نے **فقہ اسلامی تعارف و تاریخ**[۸] میں بیان کیا ہے۔ مذکورہ حضرات سے پہلے اہل رائے اور اہل حدیث کی تقسیم شہرستانی نے **الملل و النحل**[۹] میں، ابن خلدون نے الشہرستانی کی پیروی کرتے ہوئے **تاریخ ابن خلدون**[۱۰] میں اور امام شاہ ولی اللہ نے **الإنصاف في بيان أسباب الاختلاف**[۱۱] میں اپنے پیش رو حضرات کی تقلید میں اختیار کی ہے، البتہ ہر سہ حضرات نے بہ غایتِ اختصار اس بات کو بیان کیا ہے، لیکن معاصر مورخین نے اسباب و عوامل کے تناظر میں تفصیلا اس نظریے پر خامہ فرسائی کی ہے۔

اہل حدیث اور اہل رائے کی تقسیم کے اسباب و عوامل کا ناقدانہ جائزہ

اب ہم ان حضرات کے بیان کردہ اسباب و عوامل پر ایک ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں:

بنیادی طور پر اس سلسلے میں تین اسباب بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ فقہائے صحابہ کی منہج اجتہاد و قیاس کے اعتبار سے تقسیم

۲۔ عراق میں احادیث وروایات کی قلت اور حجاز میں کثرت

۳۔ عراق میں اجتہاد ورائے کی کثرت اور حجاز میں قلت

سبب اول

فقہائے صحابہ کی منہج اجتہاد و قیاس کے اعتبار سے تقسیم

مذکورہ تقسیم کے قائلین کی نظر میں اس تقسیم کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ تھا کہ خود صحابہ کرام کے مناہج اجتہاد میں اختلاف تھا، بعض صحابہ کرام رائے، قیاس اور اجتہاد سے حتی الامکان اپنے آپ کو بچاتے تھے اور صرف نصوص کے ظاہری مفہوم پر اکتفا فرماتے، جب کہ دوسری طرف ایسے صحابہ بھی تھے جن پر احکام کی علتیں

۷۔ محمد شیخ ابوزہرہ، محاضرات في تاريخ المذاهب الفقهية (مصر: مطبعة المدني)، ۲: ۳۷۔

۸۔ خالد سیف اللہ رحمانی، فقہ اسلامی (یوپی: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)، ۸۴۔

۹۔ محمد بن عبد الکریم شہرستانی، الملل و النحل (بیروت: دار المعرفة)، ۱: ۲۴۳۔

۱۰۔ عبد الرحمن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون (بیروت: دار لفکر، ۱۴۳۱ء)، ۱: ۵۶۴۔

۱۱۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، الإنصاف في بيان أسباب الاختلاف (بیروت: دار النفائس، ۱۴۰۶ء)، ۴۶۔

بتانے کا ذوق غالب تھا اور غیر منصوص مسائل میں وسعت کے ساتھ اجتہاد و قیاس سے کام لیتے اور اسی کے اثرات فقہاے تابعین تک پہنچے اور یوں فقہا کے دو بڑے گروہ اور قیاس و اجتہاد کے دو بڑے مناہج سامنے آئے۔ رمضان علی سید اپنی کتاب المدخل لدارسة الفقه الإسلامي میں لکھتے ہیں: "تأثرهم بطريقة شيوخهم كزيد بن ثابت و ابن عمر و ابن عباس إذا كان هؤلاء يتمسكون بالأحاديث و يخافون من استعمال الرأي تورعا و احتياطا لدينهم." (۱۲) (اہل مدینہ اپنے شیوخ کے طریقے سے متاثر تھے، جیسے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، کیوں کہ یہ لوگ احادیث سے تمسک کرتے تھے اور راے و قیاس کے استعمال سے تقوی اور دین داری کی وجہ سے ڈرتے تھے۔)

اس سبب کے بارے میں چند گزارشات

۱- دور تابعین میں اگرچہ صحابہ نے خاص خاص شہروں میں مسند تدریس سنبھالے، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ جس شہر میں جس صحابی نے ڈیرے ڈال دیے، صرف اسی شہر کے مکین ہی ان سے استفادہ کرتے، بلکہ اس وقت تو طلب علم کے لیے مختلف شہروں میں سفر کا رواج عروج پر تھا، تشنگان علم در در کی خاک چھانتے، اور جس شہر کے بارے میں کسی صاحب علم کے بارے میں سنتے تو اسی کی طرف کوچ کر جاتے، چناں چہ مدینہ کے معروف تابعین کا سلسلۂ تلمذ جس طرح مدینہ میں مکین صحابہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچتا ہے، اسی طرح ملک عراق و شام کے اکابر تابعین نے بھی مدینہ کی ان درس گاہوں سے کسب فیض کیا، یہی وجہ ہے کہ عراق کے معروف فقہا علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ علیہ، مسروق بن الاجدع رحمۃ اللہ علیہ، اسود بن یزید رحمۃ اللہ علیہ، عامر بن شراحیل الشعبی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر تابعین کے اساتذہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے نام سر فہرست ہیں۔ اسی طرح مدینہ کے بعض تابعین کا دیگر امصار کے صحابہ سے کسب فیض معروف بات ہے، ابن حزم اپنی کتاب الأحكام میں لکھتے ہیں:

۱۲- سید رمضان علی، المدخل لدراسة الفقه الإسلامي (۱۴۰۳ھ)، ۷۷۔

و هكذا صحت الآثار بنقل التابعين من سائر الأمصار عن أهل المدينه و بنقل التابعين من أهل المدينة و من بعدهم عن أهل الأمصار فقد صحب علقمة و مسروق عمر و عثمان و عائشه أم المؤمنين و اختصوا بهم و أكثروا الأخذ منهم.(١٣)

اسی طرح معروف شہروں کے تابعین کا مدینہ والوں سے روایات لینے کے بارے میں صحیح آثار موجود ہیں، اور ایسے ہی مدینہ کے تابعین اور تبع تابعین کا دیگر اہل بلاد سے استفادہ کرنے کے بارے میں بھی روایات موجود ہیں۔ یہ بات ثابت ہے کہ (کوفہ کے اکابر تابعین جیسے) علقمہ اور مسروق نے (مدینہ کے اکابر صحابہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحبت اختیار کی، ان سے خصوصیت سے استفادہ کیا اور ان سے بہت ساری چیزیں حاصل کیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ مدینہ میں مقیم صحابہ سے ہر شہر خصوصا اہل کوفہ کے اکابر تابعین نے خوب استفادہ کیا ہے، تو اس صورت میں یہ کہنا کسی صورت درست نہیں بنتا کہ مدینہ والوں کے منہج میں ان کے اساتذہ صحابہ کا اثر تھا۔ اگر معاصر حضرات کا مذکورہ نظریہ مان لیا جائے تو ایک معقول سوال اس موقع پر ذہن میں آتا ہے کہ انھی اساتذہ سے تو کوفہ کے تابعین نے بھی استفادہ کیا تو ان پر رائے کی تقلیل اور اجتہاد و قیاس سے کنارہ کشی کا اثر کیوں نہیں پڑا؟ ایک ہی طرح کے اساتذہ سے حصول علم کے بعد منہج میں فرق کی نسبت اساتذہ کی طرف کرنا علمی حوالے سے کوئی مضبوط بات نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو متفقہ طور پر اجتہاد و قیاس کی کثرت کے حوالے سے معروف ہیں، ان کے تلامذہ میں صرف اہل کوفہ نہیں تھے، بلکہ مدینہ، شام اور بصرہ کے اکابر تابعین نے ان سے استفادہ کیا۔

۲- مدینہ میں مقیم صحابہ خصوصا حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بات کرنا کہ وہ رائے و اجتہاد سے احتیاط کرتے تھے اور نصوص کے ظاہری مفہوم پر ہی اکتفا کرتے تھے، محل نظر ہے۔ ان صحابہ کرام کی فقہی آرا سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ بہ کثرت ایسی روایات موجود ہیں، جن میں ان حضرات نے غیر منصوص مسائل میں قیاس و اجتہاد سے کام لیا اور بعض واقعات میں ان حضرات کا اجتہاد نصوص میں تعلیل پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض صحابہ کرام کی فقہی آرا پر باقاعدہ ضخیم موسوعات بھی تیار ہو چکے ہیں۔(١٤) ابن قیم نے **إعلام الموقعین** میں ان صحابہ کی فہرست دی ہے، جن سے بہ کثرت فتاوی منقول ہیں، ان میں مدینہ میں مقیم یہ چاروں صحابہ

١٣- ابو محمد علی بن احمد ابن حزم، الإحكام في أصول الأحكام (بیروت: دار الآفاق)، ٤: ٢١٠۔

١٤- خاص طور پر معروف شامی محقق محمد رواس قلعہ جی مرحوم کے تیار کردہ خلفاے راشدین سمیت متعدد معروف صحابہ کرام اور تابعین کی فقہی آرا پر مشتمل موسوعات۔

سرفہرست ہیں، چناں چہ لکھتے ہیں: "وكان المكثرون منهم سبعة، عمر بن الخطاب، و علي بن أبي طالب، وعبد الله بن مسعود، وعائشة أم المؤمنين ،و زيد بن ثابت، و عبد الله بن عباس، و عبد الله بن عمر." (۱۵) (صحابہ میں وہ حضرات جن سے سب سے زیادہ فتاوی منقول ہیں، وہ سات حضرات ہیں: حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم۔)

فتوے میں قیاس و اجتہاد کا استعمال ایک لازمی امر ہے۔ اگر یہ مفروضہ مان لیا جائے کہ صحابہ کرام اجتہاد و قیاس سے بچتے تھے تو فتاوی کی مقدار میں وہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی کے درجے تک کیسے پہنچے، جن کے بارے میں اتفاق ہے کہ بہ کثرت اجتہاد و قیاس سے کام لیتے تھے۔

اس کے علاوہ ان حضرات نے ایسے مواقع پر بھی تعلیل سے کام لیتے ہوئے اجتہاد کیا، جن میں ان کا اجتہاد نص کے ظاہری مفہوم کے معارض ہوتا، چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عورتوں کے مساجد میں آنے سے متعلق اجتہاد معروف و مشہور ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح حدیث کے ہوتے ہوئے انھوں نے عورتوں کے مسجد جانے پر نکیر فرمائی تھی، حالاں کہ حدیث میں ان کو مسجد میں آنے کی صریح اجازت دی گئی تھی، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فتوی یہ تھا کہ یہ اجازت خاص شرائط کے ساتھ مشروط ہے، گویا تعلیل کے ذریعے نص کا عام مفہوم خاص محل پر محمول کیا۔ (۱۶) اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا معارضہ کتب احادیث میں منقول ہے، کہ جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی کہ آگ پر پکی ہوئی چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں گرم پانی سے وضو کروں تو میرے وضو کا کیا حکم ہوگا؟ جس پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ناراض ہوتے ہوئے فرمایا: "يا ابن أخي إذا سمعت حديثا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا تضرب له مثلا." (۱۷) (اے بھتیجے! جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث آجائے تو اس کے لیے (معارضہ کے طور پر) عقلی مثالیں نہ دیا کرو۔)

۱۵- ابوعبد اللہ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ، إعلام الموقعين (رياض: دار ابن الجوزي، ۱۴۲۳ھ)، ۲: ۱۸۔

۱۶- محمد بن اسماعیل البخاری، صحيح البخاري (بيروت: دارالكتب العلميه، ۱۴۳۰ھ)، ۲: ۲۰۷، رقم ۸۶۹۔

۱۷- ابوعیسی محمد بن عیسی الترمذی، سنن الترمذي، أبواب الطهارة: باب الوضوء مماغيّرت النار (مصر: مصطفى البابي الحلبي، ۱۹۷۵ء)، ۷۹۔

غرض کتب احادیث میں ان حضرات کے اجتہادات اور قیاسات بہ کثرت مروی ہیں، جن میں ان حضرات نے نصوص میں تعلیل سے وسیع پیمانے پر کام لیا، یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں ان حضرات کے فتاوی اور اجتہادات پر ضخیم مجلدات وجود میں آچکی ہیں۔[۱۸] ان اجتہادات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ یہ قیاس واجتہاد سے بچتے تھے، محل نظر ہے۔

ان حضرات کے بارے میں قیاس واجتہاد سے کنارہ کشی کے نظریے کی بنیاد در اصل وہ روایات ہیں، جن میں ان حضرات کا اتباع سنت، نصوص پر سختی کے ساتھ جمنا اور حتی الامکان فتوے کی ذمے داری سے بچنا منقول ہے، چناں چہ امام دارمی نے **سنن دارمی** میں باب من هاب الفتيا کے نام سے باقاعدہ ایک باب باندھا ہے، جس میں ان روایات کو ذکر کیا ہے، جن میں صحابہ وتابعین سے فتوے کے بارے میں احتیاط اور اس عظیم ذمے داری سے حتی الامکان بچنے کا ذکر ہے۔[۱۹] لیکن اس قسم کی روایات صرف ان مدنی صحابہ سے منقول نہیں ہیں، بلکہ فتوی و اجتہاد کے حوالے سے معروف صحابہ جیسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت اکابر تابعین سے بھی اس قسم کے اقوال مروی ہیں، چناں چہ **سنن دارمی** میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: ”من أفتى عن كل ما يسأل فهو مجنون.“[۲۰] (جو آدمی (سوال کی نوعیت سے صرف نظر کرتے ہوئے) ہر پوچھی گئی چیز کے بارے میں فتوی دے تو وہ مجنون ہے۔) بلکہ امام درامی نے ابن ابی لیلی سے صحابہ کا فتوے کے بارے میں عمومی نظریہ یوں نقل کیا ہے: ”لقد أدركت في هذا المسجد عشرين و مائة من الأنصار...و لا يسئل عن فتياه إلا ودّ أن أخاه كفاه الفتيا.“[۲۱] (میں نے انصار صحابہ میں سے ایک سو بیس ایسے اصحاب پائے ہیں، کہ جب ان میں سے کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا، تو اس کی خواہش ہوتی کہ اس کا بھائی اس کی طرف سے اس فتوی میں کفایت کرلے، یعنی وہ اس کی طرف سے یہ فتوی دے۔)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ **الإنصاف** میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتوے کے بارے میں احتیاط نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”سئل عبد الله بن مسعود عن شيء، فقال: إني لأكره أن أحل لك شيء

۱۸۔ مثال کے طور پر شامی محقق رواس قلعہ جی کے موسوعات۔

۱۹۔ الدارمی، نفس مصدر، ۱: ۵۰۔

۲۰۔ نفس مصدر، ۱: ۵۹۔

۲۱۔ نفس مصدر، ۱: ۵۹۔

حرمه الله عليک، أو أحرم ما أحله الله لک."[۲۲] (حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں ناپسند کرتا ہوں کہ اللہ کی حرام کردہ اشیا کو تیرے لیے (اپنے فتوی سے) حلال کردوں یا حلال چیزوں کو (فتوی سے) تیرے اوپر حرام کردوں۔) چناں چہ یہی وجہ ہے کہ محمد الدسوقی **مقدمة في دراسة الفقه الإسلامي** میں لکھتے ہیں: "وقد وجد في كل من المدرستين من هاب الفتيا و انقبض عنها إذا لم يكن في حكمها أثر محفوظ، كما وجد في كلتيهما من جرء على الفتيا و استخدام عقله في التخريج و القياس."[۲۳] (ہر دو مکاتب فکر میں ایسے افراد پائے جاتے تھے، جو فتوی دینے سے احتیاط کیا کرتے تھے، اور خاص طور پر ان مسائل میں فتوی دینے سے رکتے تھے، جن میں متقدمین کے اقوال میں سے کوئی قول نہ ہو۔ اس کے برعکس دونوں مکاتب میں وہ لوگ بھی موجود تھے، جو فتوے کے حوالے سے جرأت رکھنے والے اور مسائل کی تخریج اور ایک دوسرے پر قیاس کرتے وقت عقلی مقدمات سے کام لیتے تھے۔) لہٰذا جب فتوے میں احتیاط مدینہ میں مقیم صحابہ کے بجائے تمام معروف فقہا صحابہ کا عمومی عمل تھا، خواہ کسی بھی شہر سے تعلق ہو، تو اس بنیاد پر یہ فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ میں مقیم صحابہ فتوی و اجتہاد سے بچتے تھے اور دیگر صحابہ خاص کر عراق میں موجود صحابہ قیاس و اجتہاد سے زیادہ کام لیتے تھے؟

سبب دوم:

عراق میں احادیث کی قلت اور حجاز میں کثرت

اہل رائے اور اہل حدیث کی تقسیم کا دوسرا بڑا سبب عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چوں کہ عراق میں احادیث و روایات حرمین شریفین سے دور ہونے کی وجہ سے حجاز کی بہ نسبت کم تھیں، اس لیے اہل عراق اجتہاد و قیاس میں رائے پر زیادہ انحصار کرتے تھے، جب کہ دوسری طرف حجاز خصوصا مدینہ قلب اسلام ہونے کی بنیاد پر کثیر صحابہ کا مسکن تھا، اس لیے وہاں روایات کی تعداد کافی زیادہ تھی، اور اہل مدینہ کو نصوص میں عام طور پر مسائل مل جاتے تھے، اس لیے وہ اہل عراق کی بہ نسبت رائے پر بہت کم اعتماد کرتے تھے۔ مناع القطان اہل رائے اور اہل

۲۲- شاہ ولی اللہ، الإ نصاف، ۴۶۔

۲۳- محمد امینہ جابر الدسوقی، مقدمة في دراسة الفقه الإسلا مي (قطر: دار الثقافة، ۱۴۲۰ھ)، ۱۲۳۔

حدیث کے وجود میں اسباب کے ذیل میں لکھتے ہیں: " كان الحديث في العراق قليلا إذا ما قيس إلى ما لدى الحجاز."[۲۴] (عراق میں حجاز کی بہ نسبت احادیث کم تھیں۔)

اس سبب کے بارے میں چند گزارشات پیش خدمت ہیں:

۱۔ اگر ایک لمحے کے لیے اس مفروضے کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عراق میں احادیث کی قلت تھی، تو بھی اہل رائے اور اہل حدیث کی تقسیم میں یہ عامل اثر انداز نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ دور تابعین اور تبع تابعین میں طلب حدیث کے لیے رحلت اور اس کے لیے سفر ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا، مختلف شہروں میں علم حدیث کے لیے جانے کا رواج کچھ اس کثرت سے تھا کہ محدثین کو رحلة في طلب الحديث پر باقاعدہ کتب لکھنی پڑیں، چناں چہ خطیب بغدادی صاحب کی اس موضوع پر ضخیم کتاب الرحلة في طلب الحديث معروف و مشہور ہے، اس میں انھوں نے مختلف شہروں کی طرف محدثین کے اسفار کو بیان کیا ہے۔ اور خاص طور پر مدینہ مرکز اسلام ہونے کی وجہ سے علمی اسفار کے لیے بہت معروف تھا، یہاں تک کہ اندلس جیسے دور دراز کے علاقے سے بھی کافی کثیر تعداد میں محدثین مدینہ میں طلب حدیث کے لیے آتے تھے، تو عراق جو اندلس کی بہ نسبت مدینہ کے کافی زیادہ قریب تھا، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہاں سے محدثین طلب حدیث کے لیے مدینہ کی طرف نہ گئے ہوں۔ ابن سعد نے اپنی معروف کتاب الطبقات الكبرى میں کوفہ، بصرہ اور بغداد کے ان محدثین کا مفصل تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے مدینہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے احادیث لی ہیں، جلد ہشتم اور جلد نہم میں ان تین شہروں کے اکابر محدثین کا تذکرہ ہے، جنھوں نے مدینہ میں مقیم صحابہ سے روایات لیں، خصوصاً حضرت عبد اللہ بن مسعود کا کوئی ایسا معروف شاگرد نہیں ہے، جس نے حضرت عمر اور دیگر صحابہ سے روایات لینے کے لیے مدینہ کا سفر نہ کیا ہو۔[۲۵] اس لیے اگر عراق میں احادیث کی قلت مان بھی لی جائے تو محدثین نے مدینہ کے صحابہ کے پاس موجود روایات مدینہ میں جاکر ان سے حاصل کیں، تو کیا اس صورت میں اہل مدینہ کی اہل عراق پر حدیث پر فوقیت کا دعوی

۲۴۔ مناع القطان، تاريخ التشريع الإسلامي، ۲۹۰۔

۲۵۔ محمد بن سعد الزہری، طبقات ابن سعد (قاہرہ: مكتبة الخانجي، ۱۴۲۱ھ)، ۸: ۱۸۸-۲۴۲۔

کیا جاسکتا ہے؟ بلکہ اس میں تو اہل عراق کو ایک گونہ فوقیت مل گئی کہ وہ دونوں شہروں کی روایات کے جامع تھے، کیوں کہ مدینہ کی طرف تو سفر حدیث کا رجحان تھا، لیکن اہل مدینہ کا مدینہ سے خروج بہ نسبت اور شہروں کے کم تھا۔ اس کے علاوہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو مایہ ناز شاگرد اور فقہ حنفی کے ابتدائی دو بنیادی ستون امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا مدینہ کی طرف اخذ حدیث کے لیے سفر اور وہاں کئی سال تک مقیم رہ کر اہل مدینہ کی روایات کو جمع کرنے کا عمل معروف ہے۔ ان اسباب کی بنا پر دکتور شرف محمود اپنے ضخیم مقالے مدرسة الحديث في الكوفة میں لکھتے ہیں: "فقد كانت المدينة أهم المراكز العلمية التي ساهمت في تأسيس المدرسة الحديثية في الكوفة." [۲۶] (یقینا مدینہ تمام مراکز علمیہ سے اہم ترین مرکز تھا، جس کا کوفہ میں مکتب حدیث کی تشکیل میں بنیادی کردار تھا۔)

۲۔ عراق میں قلت حدیث کا دعوی علم حدیث کی تاریخ کی رو سے ایک نہایت کم زور اور بے بنیاد دعوی ہے۔ اس وقت کے مراکز علمیہ میں کوفہ، بصرہ اور بغداد اہم ترین مراکز سمجھے جاتے تھے، اور کوئی ایسا قابل ذکر محدث نہیں ملتا، جس نے عراقی درس گاہوں سے فیض حاصل نہ کیا ہو، حدیث کی معروف کتب کے مصنفین میں سے تقریبا ہر ایک نے طلب حدیث کے لیے عراق خصوصا کوفہ کا سفر کیا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخارا سے، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے خراسان سے، امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے سجستان سے، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ترمذ سے، امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے نیشاپور سے، مستدرک حاکم کے مصنف نے امام حاکم نے نیشابور سے اور دیگر دور دراز کے محدثین نے طلب حدیث کے لیے عراق کا سفر کیا۔[۲۷] اس کے علاوہ خود عراق سے علم حدیث کے وہ آفتاب طلوع ہوئے، جن کی علمی چمک سے اب تک علم حدیث جگمگا رہا ہے۔ عبد الرحمن بن مہدی، محمد بن سیرین، یحیی بن سعید القطان، ابو داؤد الطیالسی، امام احمد بن حنبل، خطیب بغدادی، امام دارقطنی، یحیی بن معین، عامر الشعبی، ابو اسحاق السبیعی، امام اعمش، مسعر بن کدام، منصور بن المعتمر، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح، یحیی بن آدم، ابو بکر بن ابی شیبہ، سعید بن جبیر، اور علم حدیث کے دیگر روشن ماہتاب عراقی درس گاہوں سے ہی

۲۶۔ شرف محمود محمود سلمان، مدرسة الحديث في الكوفة (مصر: جامعة الأزهر)، ۴۰۳۔

۲۷۔ نفس مرجع، ۴۱۱ – ۴۲۸۔

طلوع ہوئے۔[۲۸] یہ وہ حضرات ہیں، جن کے تذکرے کے بغیر علم حدیث کی تاریخ نامکمل سمجھی جاتی ہے ۔ نمونے کے طور پر چند معروف نام پیش کیے گئے ،ورنہ طبقات الکبری کی دو جلدیں صرف عراقی حفاظ و محدثین کے تذکرے پر مشتمل ہیں ، جس سے عراق میں حدیث و محدثین کی کثرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۳- جن محدثین نے طلب حدیث کے لیے عراق کا سفر کیا، ان کے تاثرات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث و محدثین کی کثرت اور علمی درس گاہوں کی بہتات میں عراق کے تین بڑے شہروں، کوفہ ،بصرہ اور بغداد کا ثانی نہیں تھا، چناں چہ سر تاج محدثین امام بخاری اپنے علمی اسفار گنواتے ہوئے فرماتے ہیں:"دخلت إلى الشام و مصر و الجزيرة مرتين، و إلى البصرة أربع مرات، و أقمت بالحجاز ستة أعوام، و لا أحصي كم دخلت كوفة و بغداد مع المحدثين."[۲۹] (میں طلب حدیث کے لیے شام، مصر اور جزیرہ میں دو مرتبہ گیا، بصرہ کا چار مرتبہ چکر لگایا، جب کہ حجاز میں چھے سال مقیم رہا، لیکن میں شمار نہیں کر سکتا کہ محدثین کے ساتھ کتنی بار بغداد اور کوفہ گیا۔)

قافلۂ محدثین کے اس عظیم سالار کے اس فرمان سے کوفہ وبغداد کی حدیث کے حوالے سے شہرت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نیز محدثین کا لفظ بتارہا ہے کہ بغداد و کوفہ کی علمی درس گاہوں سے کسب فیض میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اکیلے نہیں تھے ،بلکہ اطراف عالم کے محدثین کے قافلے در قافلے ان علمی مراکز سے علم کی پیاس بجھانے کے لیے بار بار چکر لگاتے رہے۔

امام ابو داؤد کے صاحب زادے عبد اللہ بن سلیمان بن الاشعث فرماتے ہیں:"دخلت الكوفة و أكتب عن أبي سعيد الأشج ألف حديث فلما كان الشهر حصل معي ثلاثين الف حديث."[۳۰] (میں کوفہ گیا اور ہر روز ابو سعید سے ایک ہزار حدیثیں پڑھ کر لکھتا تھا، اس کا نتیجہ یہ

۲۸- نفس مرجع، ۱۷۰ – ۲۳۸۔

۲۹- ابن حجر احمد بن علی العسقلانی، فتح الباري (المكتبة السلفية)، ۱: ۴۷۸۔

۳۰- حافظ ابو بکر احمد بن علی البغدادی، تاریخ بغداد (بيروت: دار الغرب الإسلامي، ۱۴۲۲ھ)، ۱۱: ۱۳۸۔

ہوا کہ مہینے کے آخر میں میرے پاس تیس ہزار احادیث کا مجموعہ تیار ہو گیا۔) امام ابو داؤد کے باکمال صاحب زادے کے اس قول سے اندازہ لگا جاسکتا ہے کہ جب صرف ایک محدث کے پاس روایات کی کثرت اتنی تھی کہ ایک مہینے میں ان سے تیس ہزار احادیث حاصل کیں، تو عراق کے بقیہ حفاظ حدیث کی حدیث دانی کا کیا عالم ہو گا۔ امام انس بن سیرین کوفہ میں حدیث کی کثرت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "أتيت الكوفة فرأيت فيها أربعة آلاف يطلبون الحديث و أربع مائة قد فقهوا."[۳۱] (میں کوفہ آیا تو دیکھا کہ چار ہزار طالبینِ حدیث علم حدیث کی تحصیل میں مصروف تھے اور چار سو مکمل فقیہ بن چکے تھے۔)

اسی طرح معروف محدث عفان بن مسلم فرماتے ہیں: "فقدمنا ألف حديث[۳۲] الكوفة فأقمنا أربعة أشهر، و لو أردنا أن نكتب ألف مائه حديث لكتبنا بها، فما كتبنا إلا خمسين."

(ہم کوفہ آئے، اور وہاں چار مہینے قیام کیا، اگر ہم چاہتے تو اس مدت میں ایک لاکھ احادیث لکھ سکتے تھے، لیکن ہم نے اس عرصے میں پچاس ہزار روایات لکھیں۔) اگر عراق کے صرف ایک خطے میں چار ماہ کی قلیل مدت میں طالبینِ حدیث ایک لاکھ تک روایات جمع کر سکتے تھے تو بقیہ خطوں کو ملانے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ روایات و احادیث کی کثرت کا کیا عالم ہو گا؟ کیا معروف محدثین کے ان بیانات کے بعد یہ دعوی کرنا صحیح ہو گا کہ عراق میں احادیث کی قلت تھی؟ عجیب بات ہے کہ عراق میں قلت حدیث کے مدعی حضرات نے اپنے اس دعوے پر دور تابعین و تبع تابعین کے کسی قابل ذکر محدث کا قول ذکر نہیں کیا ہے۔

۴۔ معاصر تحریرات میں عراق میں قلت حدیث کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ عراق مرکز اسلام یعنی حرمین شریفین سے دور تھا، اس لیے وہاں حدیث و روایات کافی کم تعداد میں تھیں، حالاں کہ تاریخی طور پر یہ بات مسلم ہے صحابہ کی ایک کثیر تعداد نے عراق خصوصاً کوفہ کو مسکن بنایا، کیوں کہ کوفہ شہر کو چھاؤنی کے طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑے اہتمام سے آباد کیا تھا، حضرت

۳۱۔ قاضی حسن بن عبد الرحمن الرامہرمزی، المحدث الفاصل بين الراوي و الواعي (بیروت: دار لفکر، ۱۳۹۱ھ)، ۵۶۰۔

۳۲۔ نفس مرجع، ۵۲۶۔

عمر رضی اللہ عنہ کے اس اہتمام اور دل چسپی کا نتیجہ تھا کہ اکابر صحابہ جوق در جوق عراق منتقل ہوتے گئے، خلافت مرتضوی کے زمانے میں جب کوفہ مملکت اسلام کا دارالحکومت بنا، اور کوفہ میں باب مدینۃ العلم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دربار خلافت سجایا تو دارالحکومت ہونے کی بنا پر حرمین شریفین اور دیگر خطوں سے ایک خلق کثیر نے کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ چناں چہ محدثین کی تصریحات کے مطابق کوفہ میں ۷۰ بدری صحابہ، سات سو بیعت رضوان میں شریک ہونے والے اصحاب اور مجموعی طور پر تقریباً پندرہ سو صحابہ نے کوفہ کو اپنا مسکن بنایا،[۳۳] صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کی تعداد تو اس سے کہیں زیادہ بن جاتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ عراق کے دوسے قابل ذکر شہروں میں مکین صحابہ و تابعین کو شمار کر لیا جائے تو بلاشبہ یہ تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ چناں چہ شرف محمود محمد سلمان لکھتے ہیں: "نزل الكوفة عدد كبير جدا من الصحابة، فقد كان جيش سعد بن أبي وقاص أربعين ألفا، وهم الذين سكنو الكوفة أول ما أسست ، ولا شك أن آلافا منه هؤلاء كانوا من الصحابة."[۳۴] (کوفہ میں بہت بڑی تعداد میں صحابہ نے اقامت اختیار کی، کوفہ کی تاسیس کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص کے جس لشکر نے سب سے پہلے یہاں سکونت اختیار کی تھی، اس لشکر کی تعداد چالیس ہزار تھی، بلاشبہ اس لشکر میں صحابہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔)

اور یہ بات تو یقینی ہے کہ صحابہ کے سوا باقی سب تابعین یا تبع تابعین تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں صحابہ و تابعین کا عراق کو مسکن بنانے کے بعد عراق میں قلت حدیث کے دعوے کی علمی و تاریخی حیثیت اہل علم پر مخفی نہیں ہے، چناں چہ ان وجوہات کی بنا پر مصطفی احمد الزرقا لکھتے ہیں: "وهذه الحقيقة تتنافى مع ظن قلة الحديث في العراق."[۳۵] (یہ حقیقت (عراق میں صحابہ کی کثرت) عراق میں قلت حدیث کے دعوی کے منافی ہے۔)

۳۳۔ محمود محمد سلمان شرف، مدرسة الحديث في الكوفة، ۷۲۔

۳۴۔ نفس مرجع۔

۳۵۔ مصطفی احمد الزرقاء، الفقه الإسلامي و مدارسه (بیروت: الدار الشامیه، ۱۴۱۶ھ)، ۵۹۔

ایک تاریخی اشکال اور اس کا جواب

اس موقع پر ایک تاریخی اشکال کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مورخین کی تصریحات کے مطابق عراق میں صحابہ کی کثیر تعداد نے سکونت اختیار کی، لیکن تواریخ اور خاص طور پر کتب رجال میں ان صحابہ کے ناموں کی اگر تحقیق کر لی جائے تو چند سو سے زیادہ نہیں ملتے، چناں چہ اس حوالے سے شرف محمود محمد سلیمان نے مدرسة الحديث في الكوفة میں متعدد کتب رجال سے صرف تقریباً تین سو بیس (۳۲۰) کے قریب نام اکٹھے کیے، اگر بغداد و بصرہ کو ساتھ شامل کر لیا جائے تو ہزار سے زیادہ یہ تعداد نہیں بنتی، تو صرف چند سو ناموں کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ عراق میں مقیم صحابہ کی تعداد کافی زیادہ تھی، محل نظر ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ محدثین و مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صحابہ کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، لیکن صحابہ کے حالات پر مشتمل سب سے ضخیم کتاب الإصابة میں موجود تراجم کی تعداد تقریباً بارہ ہزار دو سو ستانوے ہیں، باقی کتب کے اضافی تراجم کو شامل بھی کر لیا جائے تو پندرہ ہزار سے زائد تعداد نہیں بنتی، نیز ان کتب میں بھی صحابہ کی ایک بڑی تعداد کے بلاد، سکونت و دفن کا ذکر موجود نہیں ہے۔ ان عوامل کی بنیاد پر عراق میں موجود صحابہ کے نام زیادہ نہیں ملتے، اس لیے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا، کہ واقع میں شاید تعداد اس کے قریب قریب ہو، درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین ان محدود ناموں کے باوجود عراق میں موجود صحابہ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ذکر کرتے ہیں، جیسا کہ اس کی تفصیل پیچھے ذکر ہو چکی ہے، لہٰذا محض ناموں کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں شہر میں سکونت اختیار کرنے والے صحابہ کی تعداد حقیقت میں بھی مذکورہ ناموں کے قریب قریب ہوگی، کیوں کہ اس طرح سے تو خود صحابہ کی مجموعی تعداد صرف چند ہزار رہ جاتی ہے، جب کہ تمام مورخین و محدثین کا اتفاق ہے، کہ کم از کم ایک لاکھ تک تو تعداد ضرور پہنچتی ہے۔

تیسرا سبب:

عراق میں رائے واجتہاد کی کثرت اور حجاز میں قلت

اہل رائے اور اہل حدیث کی تقسیم کا ایک اہم سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عراق میں اجتہاد اور رائے کا استعمال بہت زیادہ تھا، چناں چہ اہل عراق کثرت سے اصولوں پر تفریع کر کے نئے مسائل کا استنباط کرتے، مسائل کو فرض کر کے اس کا حکم معلوم کرنے کی کوشش کرتے، اس کے برعکس حجاز میں رائے واجتہاد کی بجائے حدیث کی

تعلیم زیادہ ہوتی تھی، اہل حجاز صرف پیش آمدہ مسائل کے بارے میں رائے کا اظہار کرتے، اور بغیر ضرورت کے نہ تفریعات کرتے اور نہ مسائل کو فرض کر کے اس پر بحث کرتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل عراق رائے کو زیادہ استعمال کرنے کی وجہ سے "اہل رائے" اور اہل حجاز "اہل حدیث" کے نام سے مشہور ہوئے۔ مناع القطان اہل رائے کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كثرة تفريعهم الفروع لكثرة ما يعرض لهم من الحوادث، نظرًا لتحضرهم وقد ساقهم هذا إلى فرض المسائل قبل أن تقع؛ فأكثروا من "أرأيت لو كان كذا"؟ فيسألون عن المسألة ويبدون فيها حكما، ثم يفرعونها بقولهم: "أرأيت لو كان كذا"؟ ويقلبونها على سائر وجوهها، الممكنة وغير الممكنة أحيانا، حتى سماهم أهل الحديث "الأرأيتيون" وتميز منهجهم بالفقه الافتراضي.(۳۶)

اہل عراق کثرت سے تفریعات کیا کرتے تھے، کیوں کہ عراق کے ترقی یافتہ تمدن کی وجہ سے وہاں حوادث کی کثرت تھی۔ حوادث کی کثرت نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسائل کو وقوع سے پہلے فرض کریں۔ لہٰذا وہ جب کسی مسئلے کا حکم معلوم کرتے تو أراءيت لو كان كذا کہ کر مسئلہ شروع کرتے، اس کا حکم معلوم کرتے، پھر اس پر تفریعات أرايت لو كان كذا کہ کر کرتے، اور اس مسئلے کے ممکنہ بلکہ کبھی غیر ممکنہ تمام پہلوؤں پر بحث کرتے۔ اس وجہ سے اہل الحدیث نے انھیں "أرأيتون" (یعنی کثرت سے ارایت کہنے والے) کا لقب دیا۔ ان کے منہج کا بنیادی امتیاز فقہ کے فرض مسائل سوچنا تھا۔

جب کہ اہل حدیث کی بنیادی خصوصیت یوں بیان کی ہے: "كراهيتهم لكثرة السؤال. وفرض المسائل، وتشعب القضايا؛ فالحكم ينبني على قضية واقعية، لا على قضية مفترضة"(۳۷) (اہل حجاز سوال کی کثرت، مسائل کو فرض کرنے اور فقہی قضایا کے شاخ در شاخ پہلو نکالنے کو ناپسند کرتے تھے، پس ان کے نزدیک حکم شرعی صرف اس مسئلے پر لگایا جاتا، جو پیش آچکا ہوتا، نہ یہ کہ محض فرضی ہو۔)

حجاز میں رائے واجتہاد کا ایک جائزہ

حجاز خصوصا مدینہ منورہ کے بڑے فقہا کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ رائے و اجتہاد کے استعمال کے حوالے سے کسی طرح سے فقہائے عراق سے کم نہیں تھے۔ ان کی فقہی آرا، فتاوی اور غیر منصوص

۳۶۔ مناع القطان، تاريخ التشريع الإسلامي، ۲۹۱۔

۳۷۔ نفس مرجع، ۲۹۳۔

مسائل میں رائے و قیاس کا استعمال فقہائے عراق سے زیادہ نہ سہی، ان کے برابر ضرور تھا۔ اس حوالے سے چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

۱۔ اہل حجاز کے سرخیل صحابہ کرام میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"كان ابن عباس من أوسع الصحابة فتيا، وقد تقدم أن فتاواه قد جمعت في عشرين سفرا."[۳۸] (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تمام صحابہ میں سے سب سے زیادہ کثرت سے فتوی دینے والے تھے، اور یہ بات گزر چکی ہے کہ حضرت ابن عباس کے فتاوی بیس اجزا میں جمع کیے گئے۔)

۲۔ مدینہ میں مقیم صحابہ کرام میں سے رائے اور اجتہاد کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلاشبہ ممتاز ترین صحابی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فقہی آرا پر مستقل تصانیف موجود ہیں، خصوصا امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے **إزالة الخفاء** میں "فقہ عمر" کے نام سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فقہی آرا اور اجتہادات کو جمع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ابو زہرہ مرحوم لکھتے ہیں: "لأن رأي عمر فيما لا نص عليه من كتاب أو سنة الرسول كان كثيرا."[۳۹] (کیوں کہ غیر منصوص مسائل کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کافی زیادہ ہیں۔) اسی طرح محقق محمد رواس قلعہ جی کی **موسوعة فقه عمر بن خطاب** سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فقہی آرا کے تنوع اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کی موجودگی میں مدینہ منورہ میں رائے و اجتہاد کی کمی کا نظریہ تاریخی نقطہ نظر سے نہایت کم زور دعوی ہے۔

۳۔ معروف تابعی حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کا لقب فتاوی اور اجتہاد اور رائے کی کثرت کی بنا پر "الجري" پڑ گیا تھا، امام ابن قیم **إعلام الموقعين** میں لکھتے ہیں: "وكان سعيد بن المسيب أيضا واسع الفتيا... وكانوا يدعونه سعيد بن المسيّب الجريء."[۴۰] (حضرت سعید بن

۳۸۔ ابن قیم الجوزیہ، **إعلام**، ۱: ۲۸۔

۳۹۔ محمد ابوزہرہ، مالک: حياته و عصره --- آراه الفقهية (بيروت: دار الفكر العربي)، ۱۶۳۔

۴۰۔ ابن القیم، مصدرِ سابق، ۱: ۲۸۔

المسیّب رحمۃ اللہ علیہ کثرت سے فتوی دیا کرتے تھے، اور لوگ آپ کو سعید بن المسیّب جری یعنی فتوی کے بارے میں جرأت مند کے لقب سے پکارتے تھے۔) حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی آرا پر عراق سے ایک ضخیم کتاب **فقه الإمام سعيد بن المسيب** کے نام سے چھپی ہے، کتاب کے مصنف ہاشم جمیل عبد اللہ ہیں، یہ کتاب تقریباً اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہے، اس سے سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی آرا و اجتہادات کی کثرت اور تنوع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۴۔ مدینہ منورہ کے معروف فقیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے استاد ربیعہ بن عبد الرحمن کا لقب رائے اور اجتہاد کی مہارت کی بنا پر "ربیعۃ الرأی" پڑ گیا تھا۔ علامہ ذہبی **تذکرة الحفاظ** میں لکھتے ہیں: "وكان إماما حافظا فقيها مجتهدا بصيرا بالرأي ولذلك يقال له: ربيعة الرأي." [۴۱] (آپ امام، حافظ، فقیہ اور اجتہاد میں خوب بصیرت کے حامل تھے، اسی وجہ آپ کو ربیعۃ الرأی کہا جاتا تھا۔)

۵۔ مدینہ منور میں رائے واجتہاد کے حوالے سے فقہائے سبعہ بھی کافی شہرت کے حامل تھے، فقہائے سبعہ سے مراد حضرت عروۃ بن الزبیر، حضرت سعید بن مسیب، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق، حضرت خارجہ بن زید بن ثابت، حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ، حضرت ابو بکر بن عبد الرحمن، حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہم ہیں۔

عبد اللہ بن مبارک فقہائے سبعہ کے بارے میں فرماتے ہیں: "كان فقهاء أهل المدينة الذين يصدرون عن رأيهم سبعة." [۴۲] (مدینہ کے وہ فقہا جو اپنے اجتہاد اور رائے سے فیصلے صادر فرماتے تھے، سات ہیں۔) آگے ان کے طرز اجتہاد کے بارے میں فرماتے ہیں: "وكانوا إذا جاءتهم المسألة دخلوا فيها جميعا، فنظرو افيها، ولا يقضي الْقَاضِي حَتَّى يرفع إليهم." [۴۳] (جب ان کے پاس مسئلہ آتا، سب اس مسئلے کے بارے میں اکٹھے بیٹھ کر اس میں غور و فکر کرتے، اور قاضی مسئلے کو ان کے پاس بھیجنے سے پہلے فیصلہ نہیں کرتے تھے۔)

۴۱۔ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی، **تذکرة الحفاظ** (بیروت: دارلکتب العلمیة، ۱۴۱۹ھ)، ۱: ۱۱۸۔

۴۲۔ جمال الدین ابو حجاج المزی، **تهذيب الكمال في أسماء الرجال** (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۰۸ھ)، ۱۰: ۱۵۰۔

۴۳۔ نفس مصدر۔

فقہاے سبعہ کی اجتہادی آرا اور خاص طور پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی آرا کے ساتھ تقابل اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ پر فقہاے سبعہ کے اثرات کے حوالے سے معاصر سطح پر مستقل کام ہوا ہے، چناں چہ شیخ ابو زہرہ مرحوم نے **حیاۃ مالک** میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے، اس کے علاوہ اس موضوع پر ریاض یونی ورسٹی سے معروف محقق محمد مصطفی الاعظمی کی زیر نگرانی ایک مفصل مقالہ **فقه الفقهاء السبعة و أثره في فقه الإمام مالک** کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں فقہ کے جملہ ابواب میں فقہاے سبعہ کی فقہی آرا پر بحث کی گئی ہے۔ اس سے مدینہ منور میں راے و اجتہاد کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فقہ اسلامی پر فقہاے سبعہ کے اثرات کے حوالے عبد اللطیف الفرفور لکھتے ہیں:

هؤلاء هم الفقهاء السبعة الذين كوّنوا المدرسة الفقهية الأولى في هذا العصر، حتى سمي باسمهم، فقيل عصر الفقهاء السبعة، وكان عمل هؤلاء الفقهاء الأولين تأسيس الفقه الإسلامي، بوضعهم الخطوط الأولى للمنهج الفقهي، و بما رسموه من الرأي و النظر."[۴۴]

یہ وہ سات فقہا ہیں، جنھوں نے اپنے زمانے میں اولین فقہی مکتب کی تشکیل کی۔ ان کی شہرت کی وجہ سے اس زمانے کو فقہاے سبعہ کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ان فقہا کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے فقہ اسلامی کی بنیادیں رکھیں، فقہی منہج کے اولین خطوط وضع کیے اور قیاس اور راے کا نمونہ پیش کیا۔

۶- حجاز کے فقہا صحابہ و تابعین کے بعد اگر مذہب مالکی اور شافعی کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے، جن کو حجازی ہونے کی وجہ سے "اہل الحدیث" میں شمار کیا جاتا ہے، تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان مذاہب میں بھی روز اول سے راے و اجتہاد کو کلیدی حیثیت حاصل تھی، اور راے و اجتہاد کے استعمال، نصوص میں تعلیل اور فقہ تقدیری کی تشکیل میں "اہل حدیث" کے نام سے مشہور کیے جانے والے یہ دو حجازی مذاہب فقہیہ فقہاے عراق سے بڑھ کر نہیں تو ہم پلہ ضرور تھے۔ چناں چہ امام مالک کی فقہی و اجتہادی آرا پر مشتمل کتاب **المدونة الكبرى** اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے علم ریز قلم سے نکلی **كتاب الأم** سے اس بات کی بہ خوبی تائید ہوتی ہے۔ ان دونوں کتب میں فرضی مسائل کا معتد بہ حصہ موجود ہے اور مسائل کی فرضی صورتیں بنا کر اس پر احکام مرتب کیے گئے ہیں، بلکہ امام محمد کی کتب ظاہر الروایۃ کے ساتھ ان دو کتب کا تقابل کرنے سے حیرت انگیز مماثلت سامنے آتی ہے۔ ذیل میں ان تینوں کتب کے

۴۴- عبد اللطیف، **تاريخ الفقه الإسلامي**، ۳۶۔

متفرق ابواب سے چند جزئیات دی جاتی ہیں، جن کی صورتیں اگرچہ الگ الگ ہیں، لیکن مسئلے کی صورت فرض کرنے کا اسلوب اور طرز بالکل یکساں ہیں۔

المدونة الکبری سے چند جزئیات

۱۔ قَالَ مَالِكٌ: لَوْ أَنَّ نَصْرَانِيًّا أَسْلَمَ يَوْمَ الْفِطْرِ رَأَيْت عَلَيْهِ زَكَاةَ الْفِطْرِ، وَلَوْ أَسْلَمَ يَوْمَ النَّحْرِ كَانَ عِنْدِي بَيِّنًا أَنْ يُضَحِّيَ.[۴۵]

۲۔ قَالَ مَالِكٌ: لَوْ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الْحَرْبِ أَتَى مُسْلِمًا أَوْ بِأَمَانٍ فَأَسْلَمَ وَخَلَفَ أَهْلَهُ عَلَى النَّصْرَانِيَّةِ فِي دَارِ الْحَرْبِ فَغَزَا أَهْلُ الْإِسْلَامِ تِلْكَ الدَّارِ فَغَنِمُوهَا وَغَنِمُوا أَهْلَهُ وَوَلَدَهُ؟ قَالَ مَالِكٌ: هِيَ وَوَلَدُهُ فِي أَهْلِ الْإِسْلَامِ.[۴۶]

۳۔ قَالَ مَالِكٌ: لَوْ أَنَّ رَجُلًا شَهِدَ عَلَى رَجُلٍ بِأَنَّهُ أَعْتَقَ عَبْدًا لَهُ أَوْ عَلَى أَبِيهِ بَعْدَ مَوْتِهِ أَنَّهُ أَعْتَقَ عَبْدًا لَهُ فِي وَصِيَّتِهِ فَصَارَ الْعَبْدُ إِلَيْهِ فِي قِسْمَةٍ أَوْ اشْتَرَى الشَّاهِدُ الْعَبْدَ أَنَّهُ يُعْتَقُ عَلَيْهِ.[۴۷]

۴۔ قَالَ مَالِكٌ: لَوْ أَنَّ رَجُلًا اشْتَرَى طَعَامًا بِقَدَحٍ أَوْ بِقَصْعَةٍ لَيْسَ بِمِكْيَالِ النَّاسِ رَأَيْت ذَلِكَ فَاسِدًا وَلَمْ أَرَهُ جَائِزًا.[۴۸]

۵۔ قَالَ مَالِكٌ: لَوْ أَنْ رَجُلًا دَفَعَ إِلَى رَجُلٍ دَابَّةً فَقَالَ: اعْمَلْ عَلَيْهَا وَلَك نِصْفُ مَا تَكْسِبُ عَلَيْهَا كَانَ الْكَسْبُ لِلْعَامِلِ وَكَانَ عَلَى الْعَامِلِ إِجَارَةُ الدَّابَّةِ فِيمَا تُسَاوِي.[۴۹]

۴۵۔ الامام مالک بن انس، المدونة الکبری (بیروت: دار الکتب العلمیة، ۱۴۱۵ھ)، ۱: ۴۰۵۔

۴۶۔ نفس مصدر، ۲: ۲۱۷۔

۴۷۔ نفس مصدر، ۲: ۵۶۹۔

۴۸۔ نفس مصدر، ۳: ۸۹۔

۴۹۔ نفس مصدر، ۳: ۴۲۱۔

کتاب الأم سے چند جزئیات

۱- قَالَ الشَّافِعِيُّ : لَوْ أَكْرَى رَجُلٌ رَجُلًا دَارًا بِمِائَةِ دِينَارٍ أَرْبَعَ سِنِينَ فَالْكِرَاءُ حَالٌّ إِلَّا أَنْ يَشْتَرِطَهُ إِلَى أَجَلٍ.(۵۰)

۲- قَالَ الشَّافِعِيُّ : لَوْ بَاعَ رَجُلٌ رَجُلًا عَبْدًا عَلَى أَنَّ الْمُشْتَرِيَ بِالْخِيَارِ فَأَهَلَّ هِلَالُ شَوَّالٍ قَبْلَ أَنْ يَخْتَارَ الرَّدَّ، أَوْ الْأَخْذَ كَانَتْ زَكَاةُ الْفِطْرِ عَلَى الْمُشْتَرِي.(۵۱)

۳- قَالَ الشَّافِعِيُّ: لَوْ مَاتَ رَجُلٌ لَهُ رَقِيقٌ فَوَرِثَهُ وَرَثَتُهُ قَبْلَ هِلَالِ شَوَّالٍ ثُمَّ أَهَلَّ هِلَالُ شَوَّالٍ وَلَمْ يَخْرُجْ الرَّقِيقُ مِنْ أَيْدِيهِمْ فَعَلَيْهِمْ فِيهِ زَكَاةُ الْفِطْرِ بِقَدْرِ مَوَارِيثِهِمْ مِنْهُ.(۵۲)

۴- قَالَ الشَّافِعِيُّ: لَوْ أَوْصَى بِرَقَبَةِ عَبْدٍ لِرَجُلٍ وَخِدْمَتِهِ لِآخِرِ حَيَاتِهِ، أَوْ وَقْتًا فَقَبِلَا، كَانَتْ صَدَقَةُ الْفِطْرِ عَلَى مَالِكِ الرَّقَبَةِ، لَوْ لَمْ يَقْبَلْ كَانَتْ صَدَقَةُ الْفِطْرِ عَلَى الْوَرَثَةِ؛ لِأَنَّهُمْ يَمْلِكُونَ رَقَبَتَهُ.(۵۳)

۵- قَالَ الشَّافِعِيُّ: لَوْ مَاتَ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ وَتَرَكَ رَقِيقًا، فَإِنَّ زَكَاةَ الْفِطْرِ فِي مَالِهِ عَنْهُمْ، فَإِنْ مَاتَ قَبْلَ شَوَّالٍ زَكَّى عَنْهُمْ الْوَرَثَةُ.(۵۴)

الجامع الصغیر سے چند جزئیات

۱- لَو حلف لَا يدْخل هَذِه الدَّار وَهَذَا الْمنزل فَقَامَ على السَّطْح حنث.(۵۵)

۵۰- محمد بن ادریس الشافعی، الأم (بیروت:دار المعرفة)، ۲: ۶۱۔

۵۱- نفس مصدر، ۲: ۶۳۔

۵۲- نفس مصدر، ۲: ۶۴۔

۵۳- نفس مصدر۔

۵۴- نفس مصدر۔

۵۵- ابوعبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی، الجامع الصغیر، (کراچی:إدارة القران و العلوم الإسلامية، ۱۴۱۱ھ)، ۱۲۱۔

۲- لَو وطيء حرَّة بِشُبْهَة النِّكَاح ثمَّ تزوج أمة فِي عدتهَا جَاز.(۵۶)

۳- لَو تزوج الْمَرْأَة على ثوب قِيمَته خَمْسَة دَرَاهِم لَا يجب مهر الْمثل وَإِنَّمَا يجب الثَّوْب وَخَمْسَة دَرَاهِم حَتَّى يتم الْعشْرَة.(۵۷)

۴- لَو حفر بيراً فِي دَاره فَوَقع فِيهَا إِنْسَان وَمَات حَيْثُ لَا يضمن.(۵۸)

۵- لَو رمي إِلَى الصَّيْد وَهُوَ مُسلم فَارْتَد وأصابه السهْم وَهُوَ مُرْتَد فجرح الصَّيْد وَمَات حل أكله.(۵۹)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی **المدونة الکبری** امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی **الأم** اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی **الجامع الصغیر** کے متفرق ابواب سے لیے گئے ان مسائل کا طرز، اسلوب اور حکم مرتب کرنے کا انداز بالکل یکساں ہیں، اور اگر کتب کے حوالے کے بغیر یہ مسائل اکھٹے ذکر کیے جائیں، تو شاید یہ فرق کرنا بھی مشکل ہو کہ یہ الگ الگ کتب سے اخذ کردہ ہیں، چہ جائے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ الگ الگ فقہی مسالک کے مسائل ہیں۔ ان مسائل کے یکساں اسلوب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عراق کی فقہی مجالس اور حجاز کے فقہی حلقوں میں اجتہاد اور رائے کے استعمال کے حوالے سے کوئی خاص جوہری فرق نہیں تھا اور نہ ہی رائے کی کمیت کے حوالے سے دونوں حلقوں میں کوئی تفاوت تھا، بلکہ ایک اور پہلو سے اگر دیکھا جائے تو حجازی فقہا کی فقہی آرا و اجتہادات زیادہ معلوم ہوتے ہیں، کیوں کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتب ظاہر الروایۃ عراق کے تین بڑے فقہا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی آرا کا مجموعہ ہیں، جبکہ **المدونة الکبری** کی پانچ ضخیم جلدیں صرف امام مالک کے اجتہادات اور الأم کی دس ضخیم جلدیں اکیلے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی آرا پر مشتمل ہیں۔ شخصیات کی تعداد پر تقسیم کرنے سے تو حجازی مکتب کے بانیوں کے اجتہادات بہ نسبت عراقی مکتب کے زیادہ بنتے ہیں۔ اس تفصیل کے نتیجے میں معاصر محققین کی اس بات سے اتفاق کافی مشکل ہے کہ عراق میں رائے کی کثرت اور حجاز میں قلت تھی۔

۵۶- نفس مصدر، ۱۷۷۔

۵۷- نفس مصدر، ۱۸۰۔

۵۸- نفس مصدر، ۴۵۰۔

۵۹- نفس مصدر، ۴۹۸۔

۷- حجازی مکتب کے معروف فقہا اور ان کی اجتہادی آرا پر عصر حاضر میں مستقل کام ہوا ہے، خصوصاً عبدالمنعم الہاشمی کی کتاب عصر التابعين مشہور فقیہ خلیفہ بابکر الحسن کی گراں قدر کتاب الاجتهاد بالرأي في مدرسة الحجاز الفقهية اور ابوبکر اسماعیل محمد میقا کی کتاب الرأي و أثره في مدرسة المدينة اس حوالے سے بہترین کاوشیں ہیں۔ نیز تاریخ فقہ اسلامی پر لکھنے والے بعض محققین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حجاز میں رائے واجتہاد کی قلت کا نظریہ تاریخی حقائق سے میل نہیں کھاتا، شیخ ابوزہرہ مرحوم حياة مالک میں لکھتے ہیں: "انتهينا من هذه الدراسة إلى أن الرأي بالمدينة لم يكن قليلا، كما توهم عبارات بعض الكتاب."[۶۰] (مذکورہ بالا تحقیق و تفصیل سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مدینہ میں رائے کی مقدار کسی طرح سے کم نہیں تھی، جیسا کہ بعض مصنفین کی عبارات سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔)

اسی طرح شیخ مصطفی الزرقا نے الفقه الإسلامي و مدارسه میں بھی اس نظریے پر کڑی تنقید کی ہے، اور اسے تاریخی حقائق کے منافی قرار دیا ہے، ساتھ اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ المدخل الفقهي العام میں بعض معاصرین کی اتباع میں یہ نظریہ میں نے اختیار کیا تھا، لیکن غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اہل رائے اور اہل حدیث کی یہ تقسیم تاریخی حقائق کے منافی ہے۔[۶۱]

اہل الحدیث اور اہل الرائے کی اصطلاح، ایک تاریخی جائزہ

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ حجازی وعراقی فقہا کی اہل رائے اور اہل حدیث کے اعتبار سے تفریق کا معاصر نظریہ تاریخی اعتبار سے انتہائی کم زور ہے، نیز اس تفریق کے جو اسباب بیان کیے جاتے ہیں، وہ بھی محل نظر ہیں، اور ان اسباب میں بحث و تمحیص کی کافی گنجائش ہے، اب آخر میں اہل حدیث اور اہل رائے کی اصطلاح، ان کے مصداق اور مختلف استعمالات پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے، تاکہ بحث کی مزید تنقیح وتوضیح کے ساتھ ان اصطلاحات کے حوالے سے رائج مغالطوں کی بھی نشان دہی ہو جائے۔

۶۰- ابوزہرہ، مالک، ۱۷۹۔

۶۱- الزرقاء، الفقه الإسلامي ومدارسه، ص۵۹۔

اہل الرائے کی اصطلاح اور اس کا مصداق

رائے کا لفظ ایک وسیع الاستعمال لفظ ہے، آثار و اخبار میں مختلف معانی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن جب فقہی مسائل کے سیاق میں بولا جائے تو اس سے مراد قیاس و اجتہاد ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں کسی مسئلے کے بارے میں اپنے فہم دین کی روشنی میں فقہی فیصلہ صادر کرنے کو رائے کہتے ہیں۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی معروف روایت ہے، کہ جب ان سے اس غیر مدخولہ عورت کے بارے میں پوچھا گیا، جن کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کو مہر کیا ملے گا؟ جب اس حوالے سے کوئی نص نہیں ملی تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "أني سأقول برأيي، لها صداق نسائها ،لا وكس و لا شطط."[۶۲] (اس کے بارے میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرتا ہوں کہ اس عورت کے لیے اس کے خاندان کی دیگر عورتوں والا مہر ہو گا، نہ اس سے کم نہ زیادہ) اسی طرح معروف تابعی حضرت مسروق نے جب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقض وتر کے بارے میں پوچھا، تو انھوں نے فرمایا:"هو شيء أفعله برأيي ولا أرويه عن أحد."[۶۳] (یہ کام میں اپنے اجتہاد کی بنیاد پر کر رہا ہوں، کسی سے روایت کی بنیاد پر نہیں۔) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا میراث کے کسی مسئلے میں اختلاف ہوا، تو حضرت ابن عباس نے ایک قاصد ان کے پاس بھیجا کہ کیا یہ مسئلہ آپ کو کتاب اللہ میں ملا؟ تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "إِنَّمَا أَنْتَ رَجُلٌ تَقُولُ بِرَأْيِكَ، وَأَنَا رَجُلٌ أَقُولُ بِرَأْيِي."[۶۴] (آپ اپنے اجتہاد سے بات کر رہے ہیں اور میں اپنے اجتہاد سے۔)

آثار کی طرح فقہا کی عبارات میں بھی رائے کا لفظ اجتہاد اور قیاس پر بولا جاتا ہے، اس پر کثرت سے فقہا کی عبارات موجود ہیں، لیکن صرف نمونے کے طور پر ایک حوالہ دینا چاہوں گا، شوافع کے اصول فقہ کے چار

۶۲۔ ابو بکر احمد بن الحسین بیہقی، السنن الكبرى (بيروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۲۴ھ)، ۷: ۴۰۰۔

۶۳۔ ابو الحسن علی بن الجعد جوہری، مسند ابن الجعد (بيروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۱۷ھ)، ۷۹۔

۶۴۔ الدارمی، سنن، رقم ۲۹۱۷۔

ستونوں میں سے ایک المعتمد في اصول الفقه میں مصنف باب إنّا متعبدون بالقياس کے اندر قیاس کے دلائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "دَلِيل آخر ظَاهر عَن الصَّحَابَة رَضِي الله عَنْهُم أَنهم قَالُوا بِالرَّأْيِ." (۶۵) (اگلی دلیل یہ ہے کہ یہ بات واضح ہے کہ صحابہ نے رائے (قیاس واجتہاد) کا استعمال کیا ہے۔)

چوں کہ قیاس و اجتہاد پر رائے کا اطلاق ہوتا ہے، اس لیے أهل الرأي اور أصحاب الرأي سے مراد فقہا ہوتے ہیں، خواہ کسی مسلک کے بھی ہوں۔ آٹھویں صدی ہجری کے معروف حنبلی عالم سلیمان الطوفی اپنی کتاب شرح مختصر الروضة میں لکھتے ہیں: "اعْلَمْ أَنَّ أَصْحَابَ الرَّأْيِ بِحَسَبِ الْإِضَافَةِ هُمْ كُلُّ مَنْ تَصَرَّفَ فِي الْأَحْكَامِ بِالرَّأْيِ، فَيَتَنَاوَلُ جَمِيعَ عُلَمَاءِ الْإِسْلَامِ؛ لِأَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِنَ الْمُجْتَهِدِينَ لَايَسْتَغْنِي فِي اجْتِهَادِهِ عَنْ نَظَرٍ وَرَأْيٍ." (۶۶) (جان لو کہ باعتبار اضافت اصحاب الرائے سے مراد ہر وہ عالم جو شرعی احکام میں اجتہاد سے تصرف کرتا ہو، لہٰذا یہ تمام علماے اسلام کو شامل ہے، کیوں کہ مجتہدین میں سے کوئی بھی رائے اور اجتہاد سے مستغنی نہیں ہے۔)

اسی طرح علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ العرف الشذي میں فرماتے ہیں: "يستعمل لفظ أهل الرأي في كل فقيه." (۶۷) (اہل رائے کا لفظ ہر فقیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔) ان دو جلیل القدر علما کی عبارات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اہل رائے اپنے حقیقی اور لغوی معنی کے اعتبار سے ہر فقیہ پر بولا جاتا ہے، چناں چہ امام ابن تیمیہ طلاق کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ثُمَّ إنَّ كَثِيرًا مِنْ أَهْلِ الرَّأْيِ الْحِجَازِيِّ وَالْعِرَاقِيِّ وَسَّعُوا بَابَ الطَّلَاقِ." (۶۸) حجازی اور عراقی دونوں قسم کے فقہا نے باب الطلاق

۶۵- ابو الحسین محمد بن علی بصری، المعتمد في أصول الفقه (دمشق: المعهد العلمي، ۱۳۸۴ھ)، ۲: ۲۸۰۔

۶۶- نجم الدین سلیمان بن عبد القوی الطوفی، شرح مختصر الروضة (ریاض: وزارة الشؤون الإسلامية، ۱۴۱۹ء)، ۳: ۲۸۹۔

۶۷- محمد انور شاہ کشمیری، العرف الشذي (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۱۳۲۵ھ)، ۲: ۲۶۸۔

۶۸- تقی الدین ابن تیمیہ، الفتاوى الكبرى (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۰۸ھ)، ۳: ۱۹۳۔

میں توسع اختیار کیا ہے۔اس میں امام ابن تیمیہ نے مطلقا فقہا کے لیے اہل رائے کا لفظ استعمال کیا ہے، خواہ حجاز کے ہوں، یا کوفہ کے۔

اسی طرح ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے **المعارف** میں أصحاب الرأي کا عنوان باندھ کر امام ابن ابی لیلی رحمۃ اللہ علیہ، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ، امام ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر معروف فقہا کا تذکرہ کیا ہے، اور أصحاب الحدیث کا عنوان باندھ کر معروف محدثین کا ذکر کیا ہے۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اہل رائے کا لفظ اپنے اصل کے اعتبار سے مطلقا فقہا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔[٦٩]

امام ابن حزم ایک جگہ **الأحکام** میں لکھتے ہیں: "روی عیسی بن دینار عن أبي القاسم قال سئل مالك قيل له لمن تجوز الفتيا قال لا تجوز الفتيا إلا لمن علم ما اختلف الناس فيه قيل له اختلاف أهل الرأي قال لا اختلاف أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم."[٧٠] (عیسی بن دینار ابی القاسم سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ فتوی دینا کس شخص کے لیے جائز ہے؟ تو امام مالک نے فرمایا کہ فتوی اسی شخص کے لیے درست ہے جو لوگوں کے اختلافات کو جانتا ہو، تو پوچھا گیا کہ اہل رائے یعنی فقہا کے اختلافات؟ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، نہیں صحابہ کے اختلافات۔)

لغوی معنی کے ساتھ اہل رائے کا لفظ احناف کے لیے بطور علم کے بھی استعمال ہوتا ہے، اس لیے اس کا عمومی استعمال حنفیہ کے لیے ہوتا ہے، حنبلی عالم سلیمان الطوفی لکھتے ہیں: "وَأَمَّا بِحَسَبِ الْعَلَمِيَّةِ، فَهُوَ فِي عُرْفِ السَّلَفِ عَلَمٌ عَلَى أَهْلِ الْعِرَاقِ، وَهُمْ أَهْلُ الْكُوفَةِ، أَبُو حَنِيفَةَ وَمَنْ تَابَعَهُ مِنْهُمْ."[٧١] (علمیت کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اہل رائے کا لفظ سلف کے عرف میں اہل عراق کا علم ہے۔ یعنی فقہائے کوفہ امام ابو حنیفہ اور ان کے متبعین۔)

٦٩۔ ابو عبد اللہ محمد بن مسلم ابن قتیبہ، المعارف (قاہرہ: دار المعارف)، ۴۹۴۔

٧٠۔ ابن حزم، الإحکام، ٦: ١٧٧۔

٧١۔ نجم الدین سلیمان بن عبد القوی الطوفی، شرح مختصر الروضۃ (ریاض: وزارۃ الشؤون، ۱۴۱۹ھ)، ۳: ۲۸۹۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اہل راے کا لفظ لغوی اور اضافی معنی کے اعتبار سے مطلقا فقہا کے لیے استعمال ہوتا ہے، البتہ علم ہونے کے اعتبار سے یہ فقہاے حنفیہ کا لقب ہے۔

اہل الحدیث کی اصطلاح اور اس کا مصداق

اہل حدیث کا لفظ قرن اول سے ان لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا، جن کا مشغلہ نبی پاک ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات سے وابستگی تھا، خواہ ان کا فقہی تعلق جس مسلک سے بھی ہو، پھر یہ وابستگی درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کی شکل میں ہو یا تصنیف و تالیف کی شکل میں ہو۔ ائمۂ اربعہ کے زمانے سے ہی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہونے لگا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ الأم میں ایک حدیث پر ایک ممکنہ اعتراض وارد کر کے لکھتے ہیں: ”فَإِنْ قَالَ لَكَ قَائِلٌ، أَهْلُ الْحَدِيثِ يُوَهِّنُونَ هَذَا الْحَدِيثَ.“ [۷۲] (اگر کہنے والے نے کہا کہ اہل حدیث یعنی محدثین اس حدیث کی تضعیف کرتے ہیں۔) ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ”وَأَمَّا الرَّجُلُ مِنْ أَهْلِ الْفِقْهِ يَسْأَلُ عَنْ الرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ الْحَدِيثِ فَيَقُولُ كُفُّوا عَنْ حَدِيثِهِ وَلَا تَقْبَلُوا حَدِيثَهُ.“ [۷۳] (جب فقہا میں سے کوئی اہل حدیث یعنی محدثین سے کسی آدمی کے بارے میں پوچھتا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ اس کی حدیث سے رک جاو، اور اس کی حدیث قبول نہ کرو۔)

اس عبارت میں اہل فقہ اور اہل حدیث کا تقابل کتنی صراحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے کہ اہل حدیث سے مراد یہاں محدثین ہیں۔ اسی طرح الحدیث، تفسیر یا فقہ کی تمام معروف کتب میں محدثین کا ذکر ”اہل الحدیث“ کے لفظ کے ساتھ ہوا ہے۔ نیز یہ لقب ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے، جو حدیث کے تعلم و تعلیم سے متعلق ہو، خواہ وہ حنفی ہو، شافعی، مالکی یا حنبلی۔

علامہ ذہبی معروف حنفی محدث اور امام بخاری کے استاد محمد بن یحیی الذہلی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں لکھتے ہیں: ”مُحَمَّدُ بنُ يَحْيَى بنِ عَبْدِ اللهِ بنِ خَالِدِ بنِ فَارِسِ بنِ ذُؤَيْبٍ، الإِمَامُ، العَلاَّمَةُ، الحَافِظُ،

۷۲۔ الشافعی، الأم، ۳: ۸۔

۷۳۔ نفس مصدر، ۶: ۲۰۶۔

البَارِعُ، شَيْخُ الإِسْلامِ، وَعَالِمُ أَهْلِ المَشْرِقِ، وَإِمَامُ أَهْلِ الحَدِيْثِ بِخُرَاسَانَ." (۷۴) اس میں حنفی ہونے کے باوجود امام ذہبی کو "امام اہل الحدیث" کہا، کیوں کہ وہ معروف معنی میں محدثین میں سے تھے۔ معروف مالکی محدث اور امام بخاری کے استاد محمد بن عبد ابراہیم البوشنجی کے تذکرے میں لکھتے ہیں: "الإِمَامُ، العَلاَّمَةُ، الحَافِظُ، ذُو الفنُوْنَ، شَيْخُ الإِسْلاَمِ، أَبُو عَبْدِ اللهِ، مُحَمَّدُ بنُ إِبْرَاهِيْمَ بنِ سَعِيْدِ بنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بنِ مُوْسَى العَبْدِيّ، الفَقِيْه، المَالِكِيّ، البُوْشَنْجِيّ، شَيْخ أَهْل الحَدِيْث فِي عصره بِنَيْسَابُوْرَ." (۷۵) معروف شافعی فقیہ اور خراسان کے معروف محدث ابو الولید شافعی کے تذکرے میں لکھتے ہیں: "قَالَ الحَاكِمُ: هُوَ أَبُو الوَلِيْدِ القُرَشِيّ الأُمَوِيّ الشَّافِعِيّ إِمَامُ أَهْلِ الحَدِيْث بِخُرَاسَانَ." (۷۶) کتب رجال میں اس کی مثالیں بکھری پڑی ہیں کہ محدثین پر اہل حدیث کا اطلاق کیا گیا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مسلک اور مکتب سے ہو۔ نمونے کے طور پر صرف تین مثالیں پیش کیں۔

اہل الحدیث بہ طور فقہی مسلک

اس موقع پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اہل الحدیث کا لفظ محدثین کے لیے استعمال ہوتا ہے، تو شروح حدیث اور کتب الخلافیات یعنی وہ کتب جن میں فقہی مسائل میں مختلف مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں فقہی مسالک کے ساتھ اہل الحدیث کو ایک مستقل فقہی مسلک کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے اور اس کا مصداق کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ محدثین میں سے چند معروف حضرات خصوصاً امام داود ظاہری اور امام اسحاق بن راہویہ نے الگ الگ فقہی مکتب کی بنیاد رکھی، اسی طرح مشہور محدثین جیسے اصحاب صحاح الستہ اور دیگر معروف محدثین، اگرچہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کی طرف نسبت کیا کرتے تھے، لیکن بہت سارے مسائل میں انھوں نے اپنے فہم حدیث کی بنیاد پر مستقل موقف اپنایا، اور یہ موقف اکثر مسائل میں معروف محدثین کا ایک جیسا ہوتا، اس لیے ان کی اہمیت، اور علمی مقام کی وجہ سے فقہی مسائل کے ذکر کے ضمن میں محدثین کی آرا مستقل ذکر کی جاتیں۔

۷۴- شمس الدین محمد بن احمد الذہبی، سیر أعلام النبلاء (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۰۵ھ)، ۱۲: ۲۷۳۔

۷۵- نفس مصدر، ۱۳: ۵۸۱۔

۷۶- نفس مصدر، ۱۵: ۴۹۵۔

البتہ یہ بات ہے کہ یہ محدثین معروف معنی میں مجتہدین نہیں تھے، کہ انھوں نے مستقل فقہی مکتب کی بنیاد رکھی ہو، اس کے حدود و جوانب طے کی ہوں، اور ان کا حلقۂ مقلدین ہو۔ کتب الخلافیات یا شروح حدیث میں اہل الحدیث کے لفظ سے مراد کبھی امام داود ظاہری، امام اسحاق بن راہویہ اور عموما محدثین کا گروہ ہوتا ہے، جنھوں نے بہت سے مسائل میں مستقل موقف اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی آرا کے ذکر کے وقت ائمہ اربعہ کا ذکر الگ اور اہل الحدیث کا ذکر الگ کیا جاتا ہے، یہ بات بھی اس کی دلیل ہے کہ اہل الحدیث شوافع، مالکیہ یا حنابلہ کی بجائے ان محدثین کے لیے استعمال ہوتا ہے، جنھوں نے مسائل میں مستقل موقف اپنایا، بلکہ خود شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کی کتب میں اختلافی مسائل میں اہل الحدیث کا مستقل ذکر کیا گیا ہے۔ اگر معاصر فقہا کا یہ نظریہ مان لیا جائے کہ اہل الحدیث حنفیہ کے علاوہ بقیہ تین مسالک کا لقب ہے، تو انھی مسالک کی کتب میں اہل الحدیث کے مستقل ذکر کی کیا توجیہ ہو گی؟ تخصیص بعد التعمیم والی بات اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے، کہ بسا اوقات محدثین کا مذہب شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کے خلاف ہوتا ہے، تو ان کے بالمقابل اہل الحدیث کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ ان سے ایک الگ گروہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

امام نووی **المجموع** میں سعی قبل الطواف میں کے مسئلے میں لکھتے ہیں: "وَلوسَعَى قَبْلَ الطَّوَافِ لَمْ يَصِحَّ سَعْيُهُ عِنْدَنَا وَبِهِ قَالَ جُمْهُورُ الْعُلَمَاءِ وَقَدَّمْنَا عَنْ الْمَاوَرْدِيِّ أَنَّهُ نَقَلَ الْإِجْمَاعَ فِيهِ وَهُوَ مَذْهَبُ مَالِكٍ وَأَبِي حَنِيفَةَ وَأَحْمَدَ وَحَكَى ابْنُ الْمُنْذِرِ عَنْ عَطَاءٍ وَبَعْضِ أَهْلِ الْحَدِيثِ أنه يصح."[۷۷]

اس مسئلے میں ائمہ اربعہ کا مسلک الگ، جب کہ اہل حدیث یعنی محدثین کے ایک گروہ کا مسلک الگ نقل کیا ہے۔

ابن رشد مالکی رحمۃ اللہ علیہ **بداية المجتهد** میں لکھتے ہیں:

اخْتَلَفَ الْفُقَهَاءُ فِي الَّذِي يَأْتِي امْرَأَتَهُ وَهِيَ حَائِضٌ، فَقَالَ مَالِكٌ، وَالشَّافِعِيُّ، وَأَبُو حَنِيفَةَ: يَسْتَغْفِرُ اللهَ وَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ. وَقَالَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ: يَتَصَدَّقُ بِدِينَارٍ أَوْ بِنِصْفِ دِينَارٍ. وَقَالَتْ فِرْقَةٌ مِنْ أَهْلِ الْحَدِيثِ: إِنْ وَطِئَ فِي الدَّمِ فَعَلَيْهِ دِينَارٌ.[۷۸]

۷۷۔ ابوزکریا محیی الدین بن شرف النووی، **المجموع شرح المهذب** (مصر: إدارة الطباعة المنيرية)، ۸: ۷۸۔

۷۸۔ ابن رشد القرطبی، **بداية المجتهد** (بیروت: دار الفکر، ۱۴۲۴ھ)، ۱: ۱۱۵۔

اس مسئلے میں مالکیہ، شوافع اور حنفیہ کا مذہب الگ، حنابلہ کا الگ اور بعض اہل الحدیث یعنی بعض محدثین کا مسلک الگ نقل کیا گیا ہے۔ اس سے بہ خوبی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اہل الحدیث کا شمار بطور فقہی مسلک ائمہ اربعہ میں سے کسی میں نہیں ہوتا۔

معروف حنبلی فقیہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ المغنی میں شہادت کے ایک مسئلے سے متعلق لکھتے ہیں: "قَالَ أَحْمَدُ : وَلَا يُقْبَلُ إِلَّا شَاهِدَانِ وَقَالَ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْحَدِيثِ : يُقْبَلُ شَاهِدٌ وَيَمِينٌ۔"[۷۹] شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کی کتب کی ان عبارات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اہل الحدیث ان تین گروہوں میں سے کسی میں شامل نہیں ہے۔ اور خود انھی مسالک کی کتب میں اہل الحدیث کو الگ اور ممتاز گروہ کے طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اہل الحدیث یعنی محدثین کی فقہی آرا پر عصر حاضر میں مستقل کام ہوا ہے، اس سلسلے میں خاص طور پر ڈاکٹر عبد المجید محمود کی مایہ ناز کتاب **الاتجاهات الفقهية عندأ اصحاب الحديث في القرن الثالث الهجري** اس بارے میں اہم ترین کاوش ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں تفصیل سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ محدثین ائمۂ اربعہ کی طرف نسبت کے باوجود فقہی اعتبار سے الگ آرا رکھتے تھے، اس لیے فقہی اختلاف کے وقت ائمۂ اربعہ کے ساتھ اہل الحدیث کا مستقل ذکر کیا جاتا تھا۔ چناں چہ لکھتے ہیں: "لكن الفقهاء الذين يعنون بذكر المذاهب الفقهية و اختلاف العلماء، يسوقون أمثال مالک، و الثوري، والأوزاعي، كأصحاب مذاهب مستقلة ثم يعطفون عليها مذهب أهل الحديث."[۸۰] (البتہ وہ فقہا جنھوں نے مذاہب فقہیہ اور علما کے اختلافات کے ذکر کا اہتمام کیا ہے، وہ ائمۂ مجتہدین یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرنے کے بعد اس پر اہل حدیث کے مذہب کا عطف کر کے الگ ذکر کرتے ہیں۔)

۷۹۔ موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن محمد ابن قدامہ، المغني (رياض: دار عالم الكتب، ۱۴۱۷ھ)، ۱۳: ۷۴۔

۸۰۔ عبد المجید محمود، الاتجاهات الفقهية عند أصحاب الحديث في القرن الثالث الهجري (قاہرہ: مكتبة الخانجي، ۱۳۹۹ھ)، ۱۳۶۔

بحث کا خلاصہ

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ فقہاے تابعین اور ائمۂ اربعہ کی اہل رائے اور اہل حدیث میں تقسیم کرتے ہوئے احناف کو اہل رائے جب کہ بقیہ تینوں ائمہ کو اہل حدیث کے طبقے میں شامل کرنا محل نظر ہے۔ اس بارے میں جو اسباب اور وجوہات بیان کی جاتی ہیں، وہ تاریخی اعتبار سے مخدوش ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنیادی وجہ یہ بنی کہ چوں کہ اہل رائے اضافی معنی کے ساتھ احناف کے لیے بہ طور لقب اور علم کے بھی استعمال ہوتا ہے، اس لیے مفہوم مخالف سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اہل حدیث بقیہ تینوں مذاہب کا لقب ہے، حالاں کہ اہل الحدیث کا لقب صرف ان حضرات کے لیے استعمال ہوتا ہے، جنھوں نے نبی پاک ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کی حفاظت، تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، جنھیں عرف میں محدثین کہا جاتا ہے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی فقہی مکتب سے ہو۔